التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

قاضی بدرالدولہ

ڈاکٹر زیبا افتخار

This article is an attempt to re-introduce and breathe life into thepersonality and works of Qazi Babar-ud-Daula.

Amongst the most eminent personalities of the eighteenth century, we find an exemplary personality in the form of Qazi Babar-ud-Daula who served his life for the preaching of Islam and for the betterment of the then deteriorating Islamic Society in the sub-continent.

He worked tirelessly to save the Islamic society from the Jewish influence that had established ground with the arrival of the English in the sub-continent. He worked not only as a jurist and an author but also assumed the position of a mufti and used to dispense valuable knowledge in religious matters. He was altruistic and noble and inculcated incessant endeavors for the revival of Islam in its true fashion. Unfortunately, history does not acknowledge

his services and additions to the Islamic literature as they deserve, because with time, research work that was done on his personality and writings seems to have disappeared due to negligence of early historians.

The extraordinary titles that were bequeathed to Qazi Badar-ud-Daula stimulated the author's interest. The aticale in consideration was an offshoot of the research work done on the historiography of Dr. Hamidullah by the author, and contains the biography, services and the list of his writings in Arabic, Persian and Urdu.

تاریخ کے اوراق پر بہت سی شخصیات کے نام کندہ ہیں۔ شہرت جن کے قدموں میں رہی اور جن کے کارنامے علمی دنیا میں آج تک زندہ ہیں لیکن بہت سی شخصیات ایسی بھی ہیں۔ جن کے نام تاریخ کے سنہری اوراق پر کندہ تو ضرور ہوئے مگر وقت کی گرد نے ان کو دھندلا دیا اور اپنے وقت کی عظیم ہستیاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھلا دی گئیں۔

ایسی ہی شخصیات میں سے ایک شخصیت محمد صبغت اللہ قاضی بدرالدولہ کی ہے۔ عشق الٰہی اور عشق رسول میں گرفتار، ایک بے غرض انسان جس نے انگریزوں کے قبضے میں آتے ہوئے معاشرہ کو یہودی اثرات سے بچانے کے لئے زندگی وقف کردی۔ شہرت ان کی منزل کبھی بھی نہ تھی۔ انہوں نے خدمت اسلام اور خدمت انسانیت کو اپنا مشن بنایا تھا اور ساری زندگی اسلامی معاشرہ کے لئے سرگرداں رہے۔ قاضی بدرالدولہ کے نام کو مکمل طور پر فراموش نہیں کیا جاسکا، آج بھی اس نام سے آشنا لوگ موجود ہیں مگر یہ مقدار قلیل ہے میرا آپ کی شخصیت سے تعارف ان دنوں ہوا۔ جب میں آپ کے پوتے اور عالم اسلام کے نامور محقق و مورخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تاریخ نویسی پر اپنا مقالہ تحریر کررہی تھی۔ آپ کے علمی کارناموں سے آگاہی ہوئی۔ اصلاح معاشرہ کے لئے کی جانے والی قابل ذکر کوششوں، سیرت، حدیث اور فقہ پر نمایاں تصانیف، عہدہ قضاء اور افتاء کے روشن کارناموں اور نواب کرناٹک کی جانب سے دیئے جانے

والے پرشکوہ القابات نے مجھے آپ کی جانب متوجہ کیا، جیسے جیسے آپ کی شخصیت کا مطالعہ کیا نئے نئے پہلو ابھر کر سامنے آئے اور یہ ان کا حق تھا کہ ان کے علمی وفقہی کارناموں کو تاریخ کے دبیز پردوں سے باہر نکالا جائے۔

آپ کا اصل نام محمد صبغت اللہ تھا۔ ۵ محرم ۱۲۱۱ھ/۱۱ جولائی ۱۷۹۶ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔(۱) سرکاری دفاتر اور کاغذات میں ان کے نام کے ساتھ ''امام العلماء، قاضی الاسلام، قاضی الملک، منصف الدولہ، وادرس خان بہادر، قاضی محکمہ عالیہ اور خادم شریعت غرا کے پرشکوہ خطابات استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن شہرت ان کو اپنے ابتدائی معزز لقب ''بدرالدولہ'' ہی سے حاصل ہوئی۔(۲)

قاضی بدرالدولہ نے جس خاندان سے آنکھ کھولی وہ جنوبی ہندوستان کا معزز اور مشہور خاندان ''نوائط'' تھا۔ جس کی وجہ شہرت علمی وادبی، مذہبی اور ملی خدمات تھیں۔ اس خاندان کی وجاہت ہندوستان کے بڑے بڑے خاندانوں کی وجاہت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس خاندان کی انفرادیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنا نسب، شجرہ اور خاندانی تاریخ کو تحریری طور پر محفوظ رکھا۔(۳)

خاندان نوائط کا تعلق قریش کی قوم سے تھا اور نصر بن کنانہ پر جاکر ان کا نسب رسول اللہ ﷺ سے ملتا ہے۔(۴) پہلی صدی ہجری میں یہ خاندان مدینہ سے ہجرت کرکے جنوبی ہند پہنچا اور پھر وہیں بودوباش اختیار کرلی۔ ڈاکٹر حمیداللہ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ،

> ''خاندانی تالیفوں اور ان سے زیادہ سینہ بہ سینہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا خاندان تاج بن یوسف کے زمانے میں (پہلی صدی ہجری میں) دکن پہنچا اور یہ پورے تیرہ سو سال اس نے دکن میں ہی گزارے''۔(۵)

اہل نوائط کو اول اول ہندوستان کے ہندو امراء اور حکام کی سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا، مگر جلد ہی انہوں نے اپنی ذاتی قابلیت، لیاقت اور رواداری کی بدولت ایک مقام

حاصل کرلیا۔ نسلی اور سماجی حیثیت سے وہ دوسروں سے ممتاز تھے، علم وفضل کے لحاظ سے بھی نمایاں تھے لہٰذا بہمنی سلاطین اور پھر اُس کے بعد عادل شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں نے ان کی بڑی عزت کی اور انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے۔ اور اس خاندان کے افراد کو اپنا وزیر اور دیوان بنایا۔(۶) اس خاندان کے مشہور ناموں میں نقیہ عطا احمد ثانی،(۷) نقیہ علی مہائمی،(۸) قاضی محمود ہائم،(۹) امام المدرسین محمد حسین صدر مدرسہ گاواں (۱۰) شامل ہیں۔ گویا علم دوستی اور تبحر وراثتاً اس خاندان میں چلی آرہی تھی۔

خود آپ کے والد مولوی محمد غوث شرف الملک، دیوان ریاست کرناٹک تھے۔ آپ کو شرف الملک، شرف الدولہ اور غالب جنگ جیسے معزز القابات دیئے گئے۔ آپ کے والد نہ صرف سیاست میں اعلیٰ دماغ تھے بلکہ تصنیف وتالیف سے بھی خصوصی شغف رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی فلسفہ، منطق وکلام کی متعدد کتابیں، آج تک خاندانی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ خود بھی تقریباً ۳۱ کتابوں اور رسالوں کے مصنف ہیں۔ قاضی صاحب کے والد کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جو ان کو وراثتاً والد اور دادا کی جانب سے ملا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ عظیم ذخیرہ ان کے دونوں بیٹوں یعنی عبدالوہاب اور قاضی بدرالدولہ کے پاس رہا۔(۱۱)

قاضی صاحب نے اپنے آپ کو چند علوم کے حصول تک محدود نہ رکھا بلکہ آپ نے تقریباً ہر علم میں طبع آزمائی کی۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مختلف علوم وفنون کی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ جو کتاب بھی حاصل ہوجاتی تھی اسے پڑھے بغیر نہ چھوڑتے۔ اس زمانے میں کتابوں کی طباعت اور ان کا حصول اتنا آسان نہ تھا۔ زیادہ تر اعتماد خاندانی یا سرکاری کتب خانے پر تھا۔ جہاں سے کافی تعداد میں کتابیں مہیا ہوجاتی تھیں۔ قاضی صاحب کتابوں کے اس حد تک شوقین تھے کہ اگر کوئی کتاب قیمتاً یا عاریتاً نہیں مل سکتی تو خود اپنے ہاتھ سے اس کی نقل تیار کرلیا کرتے تھے۔ ان کی زیادہ تر توجہ حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف تھی۔ آگے چل کر انہوں نے ان دونوں پر پوری مہارت حاصل کی۔(۱۲)

۱۲۳۸ھ کو جب ان کے والد مولوی غوث شرف الملک کا انتقال ہوگیا تو نواب

وقت اعظم جاہ نے قاضی صاحب کو "عظیم نواز خان بہادر معتمد جنگ" کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا اور صدرالصدور مقرر کیا۔ ایک سال بعد اس عہدے کے ساتھ ساتھ افتاء کی خدمت بھی سپرد کی اور انہیں "عمدۃ العلماء بدرالدولہ" کا معزز لقب عطا کیا۔ نواب اعظم جاہ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نواب عظیم جاہ، ریاست کرناٹک کے مختار مقرر ہوئے تو انہوں نے نہ صرف قاضی بدرالدولہ کو اپنی خدمات پر بحال رکھا بلکہ ان کی دیانت داری اور نہایت احتیاط کا اعتراف بھی کیا۔ یہ اعتراف صرف زبانی نہ تھا بلکہ اپنی مہر کے ساتھ تحریری اعتراف نامہ تھا۔ ازاں بعد قاضی صاحب کو ریاست کا قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا۔ یہ نواب غلام غوث بہادر کا دور اقتدار تھا۔ انہوں نے قاضی صاحب کو "قاضی الملک، مصنف الدولہ، معدلت خان بہادر، مستعد جنگ خادم شرع شریف رسول اللہ ﷺ کے معزز خطابات سے سرفراز کیا۔ یہ القابات قاضی صاحب کو قضاء اور افتاء جیسی ذمہ دارانہ خدمات انجام دینے پر عطا کئے گئے تھے۔ لیکن قاضی صاحب کی خدمات کا اعتراف یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ چند مہینوں بعد "عمدۃ العلماء" کی جگہ "امام العلماء" اور "معدلت خان بہادر" کے بجائے "قاضی الاسلام دادرس خان بہادر" کا خطاب دیا۔ اور ساتھ ہی حکم جاری ہوا کہ ان معزز القابات کے ساتھ ایک مہر تیار کرکے قاضی صاحب کے حوالے کی جائے۔ اس کے بعد سے تمام سرکاری دفاتر اور کاغذات میں ان کے نام کے ساتھ "امام العلماء، قاضی الاسلام، قاضی الملک، منصف الدولہ، دادرس خان بہادر، مستعد جنگ، قاضی محکمہ عالیہ سرکار نواب کرناٹک، خادم شریعت غرا" لکھا جانے لگا۔ (۱۳)

قاضی بدرالدولہ، نواب غلام غوث خان بہادر کے انتقال ۱۲۷۲ھ تک قاضی القضاۃ کے عہدے پر قائم رہے۔ (۱۴) جبکہ انگریز ریاست پر اپنا اقتدار بڑھانے کے بعد ہی سے اس کوشش میں سرگرداں تھے کہ ریاست کے معاملات، عدالت اور افتاء ان لوگوں کے ہاتھوں میں دی جائے جو انگریزوں کے وفادار ہوں۔ ایک علیحدہ محکمہ عدالت کا قیام انگریزوں کا دیرینہ خواب تھا جو نواب غلام غوث خان بہادر کے انتقال کے بعد شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا۔ انگریزوں کو لامحالہ ایک مسلمان عالم کی تلاش تھی جو ان کی طرف سے قاضی القضاۃ کا عہدہ سنبھال لے اور ان کا وفادار بھی رہے۔ جبکہ قاضی بدرالدولہ انگریزوں کے سخت خلاف تھے اور

ان کے کسی کام کے نہیں تھے۔ چنانچہ قاضی بدرالدولہ کی جگہ مولوی ارتضا علی خان کو اس منصب جلیل کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ یوں مقدمات اور معاملات کے فیصلوں میں دوعملی شروع ہوگئی۔ عام لوگ ابھی تک اپنے مسائل لے کر قاضی بدرالدولہ ہی کے پاس آتے تھے، یہاں تک کہ ۱۲۷۳ھ کو ان کا دفتر بند کرادیا گیا۔ (۱۵) اس طرح وہ ۱۲۳۹ھ سے ۱۲۷۳ھ تک تقریباً چونتیس سال مقدمات کے فیصلے کرتے رہے۔ قاضی صاحب کے یہ تمام فیصلے کتابی صورت میں جمع کرلئے گئے ہیں۔ کتاب کا نام "شیصلنا مجات" ہے۔ (۱۶) یہ کتاب نہ صرف فقہی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے بلکہ اس دور کے مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی حالات کا بھی بہترین آئینہ دار ہے۔

ریاست کی صورتحال یہ تھی کہ مفتی اور قاضی، انگریز حکمرانوں کی طرف سے مقرر کئے جانے لگے تھے اور جب سرکاری عدالتوں کا ایک مرتب اور باقاعدہ نظام بھی دھیرے دھیرے وجود میں آیا تو ان قاضیوں اور مفتیوں کی حیثیت صرف حکم شرعی کے سنانے کی حد تک محدود ہوگئی۔ دو تین سال کے بعد قانون تعزیرات ہند پاس ہوا اور مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں انگریزوں کی طرف سے ہائی کورٹ قائم ہوگئے۔ یوں سرکاری طور پر مسلمانوں کو عہدہ قضاء اور افتاء سے بے دخل کردیا گیا۔ (۱۷)

مدراس، آرکاٹ، ویلور اور دیگر علاقوں میں عربی و فارسی کی تعلیم مشہور اساتذہ کے گھروں پر ہوتی تھی۔ جو استاد جس فن میں ماہر ہوتا تھا، طلبہ اس کے گھر پہنچ کر اس سے وہ خاص فن حاصل کرتے تھے۔ حکومت وقت کی جانب سے ایسے اساتذہ کے نام جاگیریں لکھ دی جاتی تھیں جس کی آمدنی پر وہ گزر بسر کیا کرتے تھے اور طلبہ کو مفت تعلیم دیتے تھے۔ لیکن جب نواب کرناٹک نے دیگر علاقوں کے علماء کو دعوت دی کہ وہ یہاں آکر تعلیم دیں تو ان کے لئے مسجد والا جاہی میں انتظام کیا گیا، اور ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی۔ یوں خودبخود ایک سرکاری مدرسے کی صورت پیدا ہوگئی۔ جس کو مسجد والا جاہی کے مشہور نام مسجد کاں (بڑی) کی مناسبت سے مدرسہ کاں کہا جانے لگا۔ اس میں نہ صرف مسلمان طلباء بلکہ ہندو طالب علم بھی علم حاصل کرنے آتے تھے۔ قاضی صاحب نے بھی مدرسہ کاں کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں،

بعد ازاں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے عمل دخل اور اثرات کی وجہ سے اس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔(۱۸) اب یہ بات کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ رہی تھی کہ ملک میں عیسائیت کا پرچار بڑی شدت سے جاری ہے۔ جس کا ایک مظہر ریاستی تعلیمی نظام کا رخ جدید اور انگریزی تعلیم کی جانب پھیر دینا تھا۔ پہلی کوشش میں مدرسوں کو نظر انداز کیا گیا اور خرچ کی مد میں دی جانے والی رقم روکی جانے لگی، دوسری کوشش کے طور پر بڑے پیمانے میں جدید طرز کے مدرسے اور کتب خانے قائم ہونے لگے۔ علماء طبقہ کے نزدیک یہ مسلمانوں کے لئے ایک بڑی سازش تھی لہذا انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ ان میں قاضی بدرالدولہ اور ان کے بھائی مولوی عبدالوہاب پیش پیش تھے۔ قاضی صاحب نے تحریری فتوٰی جاری کیا کہ،

"ہمارے مذہب کی رو سے اللہ تعالیٰ کے واسطے علم حاصل کرنا ہے۔ دنیا کے کارو خدمت حاصل کرنے کے واسطے علم پڑھنا ہمارے مذہب کے رو سے صحیح نہیں۔ بلکہ حرام ہے۔ دنیا حاصل کرنے کے واسطے علم کا حاصل کرنا جب حرام ٹھہرا تو اردو اور انگریزی اور تلنگی علم کا حاصل کرنا بغیر مصلحت دینی، کے حرام ہے۔ کیسے حلال ہوگا؟.....(۱۹)

علماء کی جانب سے شدید ردعمل سامنے آنے کے بعد انگریز اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے اور اس مدرسہ کی تنظیم نو کی گئی۔ اس کا نام تبدیل کرکے "مدرسہ اعظم" رکھا گیا، مجلس نظامت میں قاضی بدرالدولہ کو امیر مقرر کیا گیا، فقہ اور عقائد کی تعلیم کے لئے آپ ہی کی تحریر کردہ کتابیں مقرر کی گئیں۔ جس میں گلزار ہدایت، ریاض الصوم اور فوائد بدریہ وغیرہ شامل تھیں۔ قاضی بدرالدولہ نے اس کا امیر بننا اس لئے منظور کیا کہ شاید اس طرح مسلمانوں کی دینی تعلیم کو محفوظ بنایا جاسکے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ انگریزوں کا عمل دخل بہت زیادہ ہے اور وہ آزادانہ اس مدرسے کے لئے خدمات انجام نہیں دے سکتے۔ لہذا پہلے تو انہوں نے احتجاج اور تنبیہات کیں۔ مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا تو اس عہدے سے استعفیٰ پیش کردیا۔ مگر ایسے نظام تعلیم کا حصہ بننا پسند نہ کیا جو ان کے نزدیک حرام تھا۔

نواب صاحب اور ان کے دیگر افراد خانہ کی قرضہ جات کی ادائگی اور ان کے

متعلق مختلف مقدمات کے فیصلوں کے لئے ایک علیحدہ کچہری استیفاء قائم کی گئی تھی، جس کے امیر مولوی عبدالوہاب تھے۔ لیکن جب وہ حج کے لئے تشریف لے گئے تو یہ عہدہ قاضی صاحب کے سپرد کیا گیا۔ نواب صاحب کا گھرانہ بے جا اصراف سے باز نہیں آتا تھا۔ قاضی صاحب نے کئی خطوط نصیحت کے لکھے، لیکن کسی نے بھی قاضی صاحب کی نصیحت پر کان نہ دھرا تو انہوں نے اس کو بے مقصد سمجھتے ہوئے نواب صاحب کو استعفیٰ پیش کردیا۔ نواب صاحب نے یہ استعفیٰ تو منظور نہ کیا لیکن اصلاح کرانے کا وعدہ ضرور کیا۔ اور قاضی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس عہدے پر برقرار رہیں۔ یوں اب قاضی بدرالدولہ عہدہ قضاوت کے ساتھ ساتھ کچہری استیفاء کی ناظمی کی خدمات بھی انجام دینے لگے۔(۲۱)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پورے برصغیر میں صورتحال یکسر تبدیل ہوئی تو مدراس بھی اس سے نہ بچ سکا اور یہاں کے مسلمان بھی انگریز حکمرانوں کے زیرعتاب آئے بطور خاص قاضی بدرالدولہ جو اپنے فتووں کی وجہ سے انگریزوں کی نگاہوں میں ہمیشہ کھٹکتے رہے تھے، اس عتاب سے نہ بچ سکے اور نواب کرناٹک کے تمام سرکاری محکموں پر قبضہ کرنے کے بعد، قاضی بدرالدولہ کو ان کے عہدوں سے فارغ کردیا گیا۔ سرکاری محکمہ جات بند ہوجانے کے بعد قاضی صاحب کا زیادہ تر وقت درس وتدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرنے لگا۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور ہئیت کے بڑے ماہر تھے۔ ان کی مختلف کتابیں ان کے اس وصف پر گواہ ہیں۔ ان کی سیرت پاک ﷺ پر مشہور کتاب فوائد بدریہ (جس کے اب تک ۸ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں) بڑی مقبول ہوئی۔ وہ طلباء کو تفسیر، حدیث، فقہ اور طب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان کے خاندان کے اکثر افراد اور شہر مدراس کے اکثر علماء نے انہی کی شاگردی اختیار کی تھی، خود نواب غوث خان بہادر نے بھی قاضی صاحب سے حدیث کی تعلیم لی تھی (۲۲) قاضی صاحب کو طب میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔(۲۳) بعض اوقات درباری طبیب بھی ان کی طبی رائے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ ہیضہ اور طاعون جو اس زمانے میں وبائی صورت میں پھیل جانے والی اور بڑی جان لیوا بیماری تھی۔ قاضی صاحب ان بیماریوں کا کامیاب علاج کرتے تھے۔ مدراس کے اطباء میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریزی دواؤں کا استعمال شروع کیا۔ خود بھی دوا سازی میں

خاصے ماہر تھے۔ وہ روزانہ مطب کیا کرتے تھے اور یہ مطب بیوہ کے لیے وقف تھا۔ آپ سے بعض طلباء نے باقاعدہ طب کا علم حاصل کیا، آپ کے ایک شاگرد حکیم غیاث آگے چل کر بڑے مشہور ہوئے۔(۲۴) اسی طرح قاضی صاحب کو فن حساب میں بھی مہارت حاصل تھی۔ آپ کی ایک تصنیف "کفایۃ الحساب" اس کا ثبوت ہے۔(۲۵)

جنوبی ہند میں قاضی بدرالدولہ پہلے شخص ہیں جس نے اپنے زمانے کی بدعات کے خلاف آواز اٹھائی اور گلزار ہدایت کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس میں معاشرہ میں پھیل جانے والی برائیوں اور بدعات پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی اور ان مسائل کا حل بھی پیش کیا گیا۔ شادیوں میں غیر ضروری رسومات اور جہیز کی لعنت نے امیر وغریب سب کو زیر بار کردیا تھا۔ معاشرہ میں اپنا وقار بلند رکھنے کے لئے شادیوں کے مواقع پر سود پر رقم لیا اور پھر ساری زندگی اسی سود میں پھنسے رہنا ایک عام سی بات ہوگئی تھی۔ قاضی صاحب نے نہ صرف ان رسومات کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ ایک ضابطہ بنایا جس پر عمل کرنا کم ازکم خاندان کے افراد کے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ اس ضابطے کی صورت یہ تھی۔

> "اگلے زمانے میں مسلمانوں پر بہت ثروت اور فراغت تھی، اسی لئے انہوں نے ہر کام میں اپنی شان وشوکت ظاہر کی۔ چنانچہ شادیوں میں دل کی ہوس آرزو نکالنے، اسراف کے عبث طریقے رواج دیتے۔ علاوہ ہندو کی رسمیں بھی اختیار کیں..... اب اہل اسلام پر جو ضعف طاری ہے ان رسوم کی سربراہی سخت دشوار ہے۔ اس پر بھی اسراف سے باز نہیں آتے، بلکہ اکثر لوگ ملک مقبولہ اور غیر مقبولہ ان امور میں ضائع کرتے ہیں اور سودی دین میں جو اس کے عمر بھر بھی ادا نہ ہوسکے، پھنس جاتے ہیں، بہت سی جوان عورتیں جن کا بیٹھا رکھنا سخت ممنوع ہے ناکتخدا رہ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری ملت سب سے آسان کی۔ پھر ہم کس لئے اپنے ہاتھوں اس مصیبت سخت میں پھنسے رہتے ہیں۔(۲۶)

قاضی صاحب کے اس ضابطہ حیات پر کئی علماء وقت نے اپنی اپنی مہریں ثبت

کیں۔(۲۷) قاضی صاحب کو اپنے خاندان کی حد تک بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر عام لوگوں پر اتنا خاص اثر نہ ہوا۔ وہ دل سے تو ان اصلاحات کو سراہتے تھے۔ مگر عملی طور پر اختیار کرنے میں پس وپیش کرتے تھے۔ البتہ بالکلی خاندان میں ایک زمانے تک اس ضابطہ پر عمل ہوتا رہا اور آج تک بعض خاندان انہی اصولوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔(۲۸)

جب ان کی عمر ۷۰ سال سے متجاوز ہوئی تو عموماً اپنے طلبہ سے کہتے تھے کہ جلدی جلدی اپنی کتابیں پوری کرلو، کیا معلوم میں اگلے سال زندہ بھی رہوں۔ وہ اس حدیث شریف "میری امت کی اکثر عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہونگی" کا حوالہ دیتے تھے۔ وہ اپنا روزنامچہ اپنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ اس کے اکثر حصے خاندان کی مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

۲۵ محرم ۱۲۸۰ھ/۱۳ جولائی ۱۸۶۳ء کو چار دن کی علالت کے بعد، طلوع آفتاب کے وقت اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ آپ کو مسجد والا جاہی کے صحن میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کے جنازہ میں ایک جم غفیر تھا جو شریک ہوا اور سارے شہر میں غم کی لہر سی دوڑ گئی۔

آثار علمی:

قاضی بدرالدولہ، مولانا باقر آگاہ ویلوری کی طرح عربی، فارسی اور ہندی (اردو) کے شاعر تو نہیں تھے۔ مگر بلاشبہ وہ ان تینوں زبانوں کے بہترین نثار تھے۔ جنوبی ہند کی تاریخ میں آگاہ اور قاضی بدرالدولہ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ انہوں نے ۴۴ کتابیں عربی میں، ۱۵ کتابیں فارسی میں اور ۱۴ کتابیں اردو میں لکھی ہیں۔ آپ کی اکثر تصانیف حدیث، سیر اور فقہ سے تعلق رکھتی ہیں، اور مقصد تصنیفات اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ، اصلاح معاشرہ کو قرار دیا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں سب سے پہلے سرسید احمد خان نے اردو نثری تصنیفات کی طرف توجہ کی مگر ان کی مستقل تصنیفات کا دور ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے مگر قاضی صاحب کی اردو تصنیفات کا دور غدر دہلی سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے ان کی پہلی کتاب "ریاض الصوال" ہے جو انہوں نے "فوائد البدریہ" (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) سے بہت پہلے لکھی تھی۔ ذیل

میں قاضی بدرالدولہ کی عربی، فارسی، اور اردو زبانوں میں تصانیف کی فہرست دی جا رہی ہے اس فہرست کی تیاری میں محمد یوسف کوکن صاحب کی کتاب خانوادہ قاضی بدرالدولہ اور خاندانی ذرائع سے مدد لی گئی ہے۔

عربی کتب:

۱۔ الطارق فی رد المارق

(قلمی نسخہ: کتب خانہ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ، مدراس)

۲۔ ازالۃ الصمہ فی اختلاف الائمۃ

(تاریخ اشاعت، ۱۳۱۸ھ، مدراس)

۳۔ رسالہ فی تعیین الصلوۃ الوسطیٰ

(قلمی نسخہ، ذاتی کتب خانہ قاضی عبید اللہ)

۴۔ رسالہ فی صوم ستۃ شوال

(قلمی نسخہ، کتب خانہ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ)

۵۔ رسالہ فی تعلیم النساء الکتابۃ

(تاریخ اشاعت، ۱۲۷۵ھ، مدراس)

۶۔ عمدۃ الرایض فی فن الفرایض

(تاریخ اشاعت، ۱۳۳۲ھ، مدراس)

۷۔ نور العین فی المناقب الحسنین

(قلمی نسخہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

۸۔ السیر المناقب (قلمی نسخہ)

۹۔ الاربعین فی معجزات سید المرسلینﷺ

(قلمی نسخہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

۱۰۔ رسالہ فی تعیین صداق فاطمہ الزہرہ

(تاریخ اشاعت، مطبع احمدی پریس، مدراس، ت ن)

۱۱۔ رسالہ صغریٰ فی السیر و المناقب (قلمی نسخہ)

۱۲۔ فہرست احادیث معجم الصغیر (قلمی نسخہ)

۱۳۔ ہدایۃ السالک الموطا الامام المالک

(قلمی نسخہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

۱۴۔ شرح حاشیہ شرح مواقف (قلمی نسخہ)

۱۵۔ حواشی کتاب المنتقی

(تاریخ اشاعت، ۱۳۰۹ھ مطبع محبوب شاہی، حیدرآباد)

۱۶۔ حواشی صحیح مسلم

(قلمی نسخہ، خاندانی کتب خانہ)

۱۷۔ التبت فی اسانید الاحادیث

(قلمی نسخہ، خاندانی کتب خانہ)

۱۸۔ قفا العین لمن ابدع بالعشرین

(قلمی نسخہ، کتب خانہ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ)

۱۹۔ رسالۃ فی تحریم المتعۃ

(قلمی نسخہ، کتب خانہ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ)

۲۰۔ رشق السہام الی من ضعف کل مسکر حرام

(قلمی نسخہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

۲۱۔ رسالۃ فی تحریم الخضاب

(قلمی نسخہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

۲۲۔ رسالۃ فی اثبات کفر ہشت رائے

(قلمی نسخہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

۲۳۔ غنیۃ الحساب

(اصل مسودہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

۲۴۔ مکاتیب عربی

(قلمی نسخہ، کتب خانہ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ)

قاضی بدرالدولہ کے عربی زبان میں لکھے ہوئے کئی نسخے نامکمل حالت میں

ہیں ۔ یہ نامکمل نسخہ جات مختلف خاندانی کتب خانوں میں بحفاظت موجود ہیں مثلاً "شرح الکواکب الدریۂ" "شرح زواجر الارشاد" "حکایات لقمان" وغیرہ

فارسی کتب:

۱۔ نور الابصار فی سیر سید الابرار ﷺ (قلمی نسخہ، مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ، مدراس)
۲۔ داستان فہم (۱۲۹۸ھ، مطبع انوری حاکم، مدراس)
۳۔ ترجمہ شصت و یک حدیث (۱۲۸۱ھ، مطبع مخزن الاخبار، مدراس)
۴۔ رسالہ در رد ارتضا علی خان (قلمی نسخہ: مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ، مدراس)
۵۔ تنبیہ الانجیاء فی خیوۃ الانبیاء (۱۲۶۷ھ، مطبع مظہر العجائب، مدراس)
۶۔ تحفۂ اعظمیہ (۱۲۸۴ھ، مطبع سید المطابع، مدراس)
۷۔ رسالہ در رویت ہلال (۱۳۱۶ھ، مطبع عزیزی مدراس)
۸۔ رسالہ در تحریم لہو (۱۳۱۸ھ، مطبع محمدی، مدراس)
۹۔ فیصلہ جات (جلد ۱ تا ۴) (قلمی نسخہ: خاندانی کتب خانہ)
۱۰۔ روزنامچہ سفر حرمین شریفین (قلمی نسخہ)
۱۱۔ رسالہ شق القمر (قلمی نسخہ: کتب خانہ امیر نواز جنگ)
۱۲۔ فتاویٰ صبغیہ (قلمی نسخہ: ذاتی کتب خانہ مولوی عبد الرحمٰن)
۱۳۔ مجموعہ عملیات (قلمی نسخہ، ذاتی کتب خانہ قاضی عبید اللہ)
۱۴۔ رسالہ شروط اقتدا (۱۳۱۸ھ، مطبع عزیزی، مدراس)
۱۵۔ اعظم الاجر فی صلوۃ الفجر (۱۳۰۴ھ مطبع مظہر العجائب، مدراس)

فارسی زبان میں آپ کی طرف دو کتابیں "سراج التواریخ" اور "جامع الاشیاء" منسوب کی جاتی ہیں ۔ لیکن یہ درست نہیں ، در حقیقت یہ دونوں کتابیں آپ کی زیر نگرانی لکھی گئی تھیں ۔ ایک درسی کتاب "کتاب فقہ شافعی" بھی لکھنا شروع کی مگر نامکمل رہی اس کا ایک قلمی نسخہ مولوی عبد الرحمٰن کے کتب خانے میں موجود ہے ۔

اردو کتب:

۱۔ ریاض الصوان (۱۳۵۶ھ، چھٹا ایڈیشن، شمس المطابع پریس، حیدرآباد دکن)
۲۔ فوائد بدریہ (۱۲۶۳ھ، پہلا ایڈیشن، گلشن راج، مدراس ۔ اس کے بعد متعدد بار شائع ہوئی آخری ایڈیشن ۱۳۵۰ھ میں حیدرآباد سے شائع ہوا)
۳۔ ہشت گلزار فی مناقب رفیق الغار (۱۲۷۰ھ، مطبع شریفی، مدراس)
۴۔ نثر الجواہر فی مناقب السید عبد القادر (۱۲۷۷ھ، حیدرآباد)
۵۔ سیف المسلمین لہدایۃ الکافرین (ت، ن)
۶۔ خزانہ معدلت (قلمی نسخہ)
۷۔ گلزار ہدایت (قلمی نسخہ، اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے تیار کئے گئے ہیں اور خاندان کے ہر گھر میں اس کا ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے)
۸۔ رسالہ در بیان احکام عدت و وفات (۱۲۷۷ھ، مطبع مخزن الاخبار، مدراس)
۹۔ قوت الارواح شرح توشۂ فلاح (۱۳۰۰ھ، مطبع احمدی، مدراس)
۱۰۔ تفسیر فیض الکریم (۱۲۷۷ھ، جلد اول [ابتدائی چھ پاروں کی تفسیر] مطبع مظہر العجائب، مدراس)

قاضی بدر الدولہ نے سات پاروں کی تفسیر مکمل کی تھی کہ ان کا رحلت الٰہی سے انتقال ہوگیا ، بعد میں ان کی اولادوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ، پندرہ سال کی مسلسل کاوش کے بعد ۱۳۶۰ھ کو یہ تفسیر مکمل ہوئی اس کی ضخامت سات ہزار صفحات ہیں ۔

۱۱۔ فہرست النجوم (لغت نجوم و کواکب) (قلمی نسخہ، کتب خانہ امیر نواز جنگ)

تراجم:

۱۔ ترجمہ حصن حصین (قلمی نسخہ، کتب خانہ محمدی دیوان صاحب باغ)
۲۔ توشۂ فلاح (ترجمہ مناسک الایضاح) (۱۲۷۵ھ، پبلشر کا نام ندارد)

حواشی وحوالہ جات

۱۔کوکن، محمد یوسف،" خانوادہ قاضی بدرالدولہ" ج اول ۔ ص ۳۳۲ (دارالتصنیف ، مدراس، ۱۹۶۳ء)

۲۔ ایضاً ۔ ص ۳۳۳

۳۔ عبید اللہ ، " ملفوظ قاضی محمد حبیب اللہ" ص ۱۱ (دارالتصنیف ، مدراس ، ت ن)

۴۔ محمد باقر آگاہ ، "محو الجواہر" بحوالہ" خانوادہ قاضی بدرالدولہ" ، ج اول ، ص ۱۶

۵۔ محمد حمید اللہ ، ڈاکٹر " ہمارا خاندان" (مشمولہ قلمی رسالہ بزم ادب ت ن)

۶۔ "خانوادہ قاضی بدرالدولہ" ص ۴۴ تا ۴۵

۷۔ عطا احمد شافعی کو ہندوستان میں خاندان نوائط کا جد اعلیٰ قرار دیا جاتا ہے لیکن افسوس کہ ان کے حالات کہیں نہیں ملتے اور ان سے پہلے بھی ہندوستان آمد سے پہلے کا بھی سلسلۂ نسب گم ہو چکا ہے ۔ (عبید اللہ ص ۱۳)

۸۔ خاندان نوائط کے مشہور ترین بزرگ مخدوم علی مہائمی (م ۸۳۵ھ) کا شمار اولیائے دین میں ہوتا ہے مسلکاً شافعی تھے اور کئی تصانیف کے خالق ہیں ۔ آپ کی تفسیر قرآن پاک نے بڑی شہرت حاصل کی ۔ ان کا تذکرہ مشہور مورخ ابن بطوطہ نے کیا ہے (سفرنامہ ابن بطوطہ ، مترجم رئیس احمد جعفری ، نفیس اکیڈمی کراچی ، ۱۹۶۱ء) مزید دیکھئے دائرہ معارف اسلامیہ ، ج ۱۲/۲ ص ۱۶۲ تا ۱۶۳ مادہ "علی مہائمی" (دانشگاہ پنجاب ، لاہور ، بار اول ۱۹۸۰ء)

۹۔ قاضی محمود ہاشم (م ۱۱۹۰ھ) کا شمار مدراس کے مشہور قاضیوں میں ہوتا ہے ۔ نظامت انہیں ورثے میں ملی تھی ۔ درس و تدریس سے بھی وابستگی تھی ۔

۱۰۔ امام مدرسین محمد حسین (م ۱۱۹۸ھ) بڑے عالم تھے ، مدرسہ کاہاں کے منصب صدارت پر بھی فائز رہے اور اسی فرض کی ادائیگی کے دوران آپ کا انتقال ہوا آپ کے نمایاں فضائل میں سب سے نمایاں فضیلت آپ کا ۲۷ دنوں میں قرآن پاک حفظ کر لینا ہے ، کئی کتابوں اور رسالوں کے مصنف بھی ہیں ۔

۱۱۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ ، ص ۱۴۶ تا ۱۸۱

۱۲۔ احمد عطا اللہ ، " ممتاز عالم دین ڈاکٹر محمد حمید اللہ" مشمولہ " ڈاکٹر محمد حمید اللہ" مرتبہ محمد راشد شیخ ۔ ص ۴۱ (فیصل آباد ، ۲۰۰۳ء)

۱۳۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ ، ص ۳۳۱ تا ۳۳۲

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً ۳۳۶

۱۶۔ قاضی صاحب کی یہ تصنیف چار ضخیم جلدوں میں ہے ، اس کے کئی قلمی نسخے تیار کئے گئے ہیں اور مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں ۔

۱۷۔ محمد حمید اللہ ، ڈاکٹر " ہمارا خاندان"

۱۸۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ ، ص ۳۲۵

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ محمد حمید اللہ ، ڈاکٹر " ہمارا خاندان"

۲۱۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ ، ص ۳۳۲

۲۲۔ ایضاً ، ص ۳۳۵

۲۳۔ "ملفوظ قاضی محمد حبیب اللہ" ، ص ۱۷

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ ، ص ۳۶۰

۲۶۔ بدرالدولہ ، قاضی ، "گلزار ہدایت" مقدمہ (قلمی نسخہ ، خاندانی کتب خانہ کراچی)

۲۷۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ ، ص ۳۶۴

۲۸۔ خاندانی ذرائع

۲۹۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ ، ص ۳۶۳

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

حیاتِ سرسید

ڈاکٹر طاہر مسعود

Sir Syed Ahmed Khan was one of the greatest leaders who pulled the Muslims of the subcontinent out of the sordid depths to which they had fallen on political, social, educational, journalistic, linguistic, religious fronts. In a nutshell, Sir Syed made the Muslims aware of how negative influences in the name of tradition and culture had been self-inflicted by the community. He had no role model to follow, but he presented himself as a leader with the vision and competence required to rescue a nation on decline. Pakistan, without a doubt, is a result of Sir Syed's struggle in those dark years. Had it not been for him, latter-day Muslim leaders from the Quaid-e-Azam and Allama Iqbal right down to Maulana Zafar Ali Khan would have found their path

littered with potholes, it was Sir Syed who had paved the way for them. Born in Dilli, Sir Syed grew up basically under the care of his mother. After the death of his father, he joined the East India Company and saved the lives of several Englishmen in the wake of the 1857 War of Independence which was a watershed event in the life of Sir Syed who worked hard remove misunderstandings of the Masters towards their Muslim subjects. To enlighten the Muslims, he established several institutions and organizations as well as started magazine and a newspaper to enrich them with modern civilizations. And, of course, he established a college that later became the almost mythological Aligarh University, in recognition of these services, he was awarded the Sitara-e-Hind, while the University of Edinburgh conferred Doctor of Law (LLD). For his religious inclination, Sir Syed had to face accusations of being "Christaan" "Naturee" and even an atheist. In his final years, he also had to suffer from domestic worries that played heavy on his nerves. He died a somewhat dejected man on March 27, 1898.

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں پر جو تباہی و بربادی آئی تھی، اس کے بعد اس بات کا عشر عشیر بھی امکان نہ تھا کہ مسلمانانِ برعظیم میں دوبارہ سر اٹھا کے چلنے کے قابل ہو سکیں گے۔ یہ سر سید احمد خاں تھے جن کے ہاتھوں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک

کا آغاز ہوا۔ وہ انتہائی بالغ نظر، دور بیں اور مستقبل شناس انسان تھے۔ مسلمانوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کی اصلاح کی انہوں نے کوشش نہ کی ہو۔ مسلمانوں کی سیاست و معاشرت، رسم و رواج، تہذیب و تمدن، علم و ادب، تعلیم و صحافت، زبان و مذہب، غرض کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس پر انہوں نے اپنی فکر و عمل کے اثرات مرتب نہ کیے ہوں۔ وہ بے حد تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ ان کے سامنے پبلک لیڈر شپ کا کوئی نمونہ نہ تھا، لیکن انہوں نے بدلتے ہوئے حالات و ضروریات کے مطابق خود کو ڈھال کر ایک ایسے لیڈر کے طور پر خود کو پیش کیا جو بجا طور پر ایک زوال آمادہ قوم کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے منتشر اور بکھریوں میں بٹے ہوئے ریوڑ کو نہ صرف تہذیب و شائستگی اور تعلیم و تمدن سے آراستہ کیا بلکہ انہیں ایک قوم بنایا۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو قرونِ وسطیٰ سے نکال کر عہدِ جدید میں داخل کر دیا۔ ع، ان کی پس ماندگی کو دور کر کے انہیں ترقی کی شاہ راہ پر گامزن کیا۔

آج کا پاکستان سرسید احمد خاں ہی کی جد و جہد کا ثمر ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اگر وہ میدانِ عمل میں نہ کودتے تو قائدِ اعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابو الکلام آزاد، حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے رہنماؤں کے ابھرنے کا راستہ ہموار نہ ہوتا۔ سرسید نے جو کنواں کھودا تھا اس سے مسلمانوں کے ہر طبقے نے اپنی پیاس بجھائی۔ انہوں نے جو بیج بویا تھا، آج اسی کے درخت کا پھل ہم سب کھا رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی احسان مندی اور شکر گذاری کے جو تقاضے تھے وہ ہم سے پورے نہ ہوئے اور آج بھی ایک طبقہ ان کا اسی طرح نکتہ چیں ہے جیسا ان کی زندگی میں تھا۔ اس کے باوجود بہ قول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشیؒ:

> ''دنیا انہیں بہت عرصے تک ایک مورخ کی حیثیت سے جس نے متون کی تہذیب و ترتیب اور آثار کی تحقیق و تفتیش کی، ایک مصنف کی حیثیت سے جس نے اردو نثر کو تصنع کی زنجیروں سے آزاد کیا اور اس میں صاف و شفاف پانی کی طرح قدرتی روانی پیدا کی، ایک مذہبی مفکر کی حیثیت سے جس نے اسلام کی ایسی تفسیر کی بنیاد ڈالی جو عہدِ حاضر کے ذہن

کیلئے موزوں ہے، ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے جو اپنی ملت کی تعلیمی ضروریات کے متعلق صفائی سے سوچ سکتا تھا، ایک سماجی مصلح کی حیثیت سے، ایک پُر جوش انسان دوست کی حیثیت سے اور انصاف و صداقت کے لیے ایک بے خوف نبرد آزما کی حیثیت سے یاد رکھے گی۔'' ع

حالاتِ زندگی:

سرسید نے ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں۔ اور ان کا سلسلۂ نسب ۳۸ واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ جس زمانے میں بنی فاطمہ کے سادات خاندانوں کا بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے ظلم و ستم کے سبب عرب اور عراق میں رہنا مشکل بنا دیا گیا تھا، اسی دور پُر آشوب میں سرسید کے آباؤ اجداد نے ایران کے قدیم شہر و امغان کی طرف ہجرت کی تھی اور بالآخر ہرات میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں غالباً پہلی بار مغل بادشاہ شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں آئے تھے، اور تب سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک سرسید کے خاندان کا دربارِ مغلیہ سے تعلق رہا تھا۔ ع، اور مختلف وقتوں میں ان کے بزرگوں کو دربار سے خطاب بھی ملتے رہے تھے۔ سرسید کا خاندان شعر و ادب سے بھی علاقہ رکھتا تھا۔ ان کے دادا سید ہادی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا دیوان سرسید کے پاس محفوظ تھا، جو جنگِ آزادی میں تلف ہو گیا۔ سید ہادی کے بیٹے اور سرسید کے والد میر متقی درویش صفت انسان تھے۔ گو ان کا اثر و رسوخ دربار میں بھی تھا لیکن انھیں دنیاوی معاملات سے دلچسپی برائے نام تھی۔ وہ آزادی اور بے فکری سے زندگی گذارنے کے قائل تھے جس کی وجہ سے سرسید کی تربیت و تعلیم کی ساری ذمہ داری ان کی دور اندیش اور سلیقہ مند والدہ پر آپڑی تھی۔ ان کی والدہ بھی ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد یعنی سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین نہایت لائق، دانش مند اور صاحبِ علم و فضل تھے۔ ریاضی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اور اس بارے میں انہوں نے چھوٹے چھوٹے رسالے بھی تصنیف کیے تھے۔ خواجہ فرید الدین کو گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ایران میں سفارت کاری کے لیئے بھی بھیجا تھا۔ دوسری طرف مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کا بھی خطاب دے کر عہدۂ

وزارت پہ مامور کیا تھا۔[۵] سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اولاد کی تربیت کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔

سرسید کی تعلیم و تربیت:

سرسید کی تربیت کس کڑی نگرانی میں ہوئی تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے، جب انہوں نے نوعمری میں ایک بوڑھے ملازم کو تھپڑ مار دیا تھا اور ان کی والدہ نے غضب ناک ہو کر انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ اور اس وقت تک معاف نہیں کیا تھا جب تک انہوں نے بوڑھے ملازم سے اپنی تقصیر کی معافی نہیں طلب کر لی تھی۔[۶] سرسید کی تربیت کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب سرسید برسرِ روزگار ہو گئے تھے۔☆

سرسید کے والد میر متقی دلی کے صوفی بزرگ اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علیؒ اور والدہ شاہ عبد العزیزؒ سے بیعت تھیں۔ (سرسید کا نام احمد اور ان کے بڑے بھائی کا نام محمد شاہ غلام علی نے رکھا تھا۔) والدہ بہت صحیح العقیدہ خاتون تھیں۔ وہ کوئی ایسا عقیدہ نہیں رکھتی تھیں جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے۔

سرسید کی ایک بہن صفیۃ النسا بیگم اور ایک بھائی سید محمد خاں تھے۔ بہن نے تو لمبی عمر پائی لیکن بھائی کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ سرسید کو ان سے بہت محبت اور لگاؤ تھا۔ بلکہ دلی میں دونوں بھائیوں کی الفت و محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ سرسید اپنے خاندان کے اکثر بچوں کے مقابلے میں نہایت تندرست و توانا تھے۔ جب وہ پیدا ہوئے تھے تو ان کے نانا خواجہ فرید الدین نے انہیں دیکھ کر یہ تبصرہ کیا کہ ''یہ تو ہمارے گھر جاٹ پیدا ہوا ہے۔'' حالی لکھتے ہیں: ''سرسید میں جسمانی صحت کے سوا کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے انہیں دوسرے بچوں پر فوقیت دی جا سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اس لیے ان کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ چندار معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جس قدر آگے بڑھتے جایئے، اسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔''[۷]

سرسید کو ان کے خاندان کی قدیم ملازمہ مسماۃ ماں بی بی نے پالا تھا۔ اس لیے ان کو

ماں بی بی سے بہت انسیت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب ان کا انتقال ہوا۔ ان کی موت کا سرسید کو بہت صدمہ ہوا۔ والدہ نے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں۔ تم کچھ رنج مت کرو۔ سرسید کہتے ہیں کہ مجھ کو پورا یقین تھا کہ واقعتاً ایسا ہی ہے۔ ماں بی بی نے مرتے ہوئے اپنا سارا زیور سرسید کے نام کر دیا تھا۔ ایک دن والدہ نے سرسید سے پوچھا کہ کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں اور پھر ان کا جواب اثبات میں پا کر سارے گہنے خیرات کر دیے۔[۸]

بچپن میں سرسید پر کھیلنے کودنے پر نہ بہت پابندی تھی اور نہ اتنی آزادی کہ جس کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ چونکہ ان کے خاندان میں چودہ پندرہ بچے رشتہ داروں کے پہلے سے موجود تھے، جو ان کے ہم عمر تھے اور جو کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے۔ اس لیے ان کو نوکروں کے بچوں اور شرفاء کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ گھر کے بڑوں کی ہدایت تھی کہ کوئی کھیل چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے سب بڑوں کے سامنے ہی کھیلتے تھے۔ سرسید کا بیان تھا: ''باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔''[۹] اسی پابندی کی وجہ سے سرسید کو بری صحبت میں اٹھنے بیٹھنے یا آوارہ گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا۔ سرسید اپنے بچپن میں بہت مستعد، چالاک اور شوخ بھی تھے۔ ان کی شرارتوں کے دو ایک واقعات حالی نے ''حیاتِ جاوید'' میں درج کیے ہیں۔ وہ بچپن میں اکثر گیند، بلا، کبڈی، آنکھ مچولی، چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ ذرا بڑے ہوئے تو والد سے تیراکی اور تیر اندازی سیکھی۔

مقدس دینی شخصیات کی عظمت کا خیال سرسید کے دل میں بچپن ہی سے بٹھایا گیا تھا۔ والد صاحب میر متقی انہیں اکثر اپنے ساتھ لے کر شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ سرسید لکھتے ہیں:

> ''آپ کی (شاہ غلام علیؒ کی) میرے خاندان پر اس قدر شفقت و محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے...... میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ شفقت و محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ

تمیز تو ہوتی نہیں، خصوصاً صغر سن میں، جو چاہتا سو کہتا اور جو چاہتا سو کرتا اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔ میں نے اپنے دادا کو تو دیکھا نہیں۔ آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔ شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسے حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد کر رکھا ہے لیکن حقّی کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔" ۱۰

ہر چند کہ حالیؔ نے لکھا ہے کہ سرسید کے بچپن میں ان کی جسمانی صحت کے سوا کوئی بات ایسی نہ تھی کہ انھیں دوسرے بچوں پر فوقیت دی جا سکے لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ سرسید میں ذہانت اور سچائی کا مادہ بچپن ہی سے تھا۔ مثلاً حالیؔ ہی کا بیان ہے کہ سرسید والد کے ہم راہ دربار میں جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ تاخیر سے دربار پہنچے تو دربار برخواست ہو چکا تھا۔ بادشاہ اکبر شاہ نے ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر فرمایا: "دیر کیوں کی؟" حاضرین نے کہا "عرض کرو۔ تقصیر ہوئی۔" لیکن سرسید چپکے کھڑے رہے۔ جب بادشاہ نے دوبارہ پوچھا تو سچائی سے جواب دیا: "سو گیا تھا۔" بادشاہ مسکرائے اور فرمایا: "بہت سویرے اٹھا کرو۔" اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ ۱۱

دوسرا واقعہ جسے خود سرسید نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ جنرل اکٹرلونی جو خواجہ فرید الدین کے دوست تھے، ان کے گھر آئے۔ جنرل صاحب نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ سرسید کی عمر پانچ چھ برس کی ہوگی۔ انھوں نے جنرل سے پوچھا: "آپ نے ٹوپی میں پَر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دو بڑے بٹن کیوں لگائے ہیں؟" جنرل صاحب اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ ۱۲ ان سوالوں سے سرسید کی ذہانت ظاہر ہوتی ہے۔

سرسید کی رسم بسم اللہ حضرت شاہ غلام علیؒ نے کرائی۔ اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے سرسید بتاتے ہیں: "مجھ کو اپنی رسم بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی

کثرت سے جمع تھے۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علیؒ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا: پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔" مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر پڑھیں گے اور اوّل بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھتا گیا۔" ۱۳

رسم بسم اللہ کے بعد سرسید نے قرآن حکیم پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں ایک استانی نوکر تھیں۔ سرسید نے ان ہی استانی سے سارا قرآن ناظرہ پڑھا۔ پھر والدہ سے جو فارسی کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں، ان سے "گلستاں" کے چند سبق پڑھے۔ علاوہ ازیں اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے۔ ۱۴

جبکہ "بوستاں" کے اسباق نانا خواجہ فرید الدین سے لیے ۱۵ مولوی حمید الدین ایک لائق بزرگ ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے، ان سے کریما، خالق باری، آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، مبیذی، مختصر معانی اور مطول ما انا قلت تک پڑھی لیکن جو کچھ پڑھا نہایت بے پرواہی اور بے توجہی سے پڑھا۔ اس کے بعد ان کو ریاضی پڑھنے کا شوق چرایا۔ انہوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خان سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے اور دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر طب سے دل چسپی پیدا ہوئی تو حکیم غلام حیدر خان سے طب کی ابتدائی کتابوں کے درس لیے۔ چند ماہ حکیم صاحب کے مطب میں بھی بیٹھے پھر تعلیم ترک کر دی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس تھی۔

سرسید کی نوجوانی نہایت رنگین گذری۔ وہ اپنے ماموں نواب زین العابدین کے ہم راہ راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں طوائفیں دھرپت و خیال گاتی تھیں اور پھر بین بجاتی تھیں۔ ۱۶ حالیؔ نے لکھا ہے کہ اگرچہ سرسید کی سترہ اٹھارہ برس میں شادی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ان محفلوں سے خود کو نہ بچا سکے۔ لیکن پھر سرسید کا دل ان رنگ و نور کی محفلوں سے اچاٹ ہو گیا۔ اس بے رغبتی میں دیگر اسباب کے علاوہ جس چیز نے اہم کردار کیا،

وہ ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال تھا۔ بھائی کے مرتے ہی ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ عمدہ لباس پہننا یک دم ترک کر دیا، سر گھٹوا لیا، داڑھی چھوڑ دی، پائنچے ٹخنوں سے اوپر کر لیے، کرتا پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا کم کر دیا اور بالکل مولوی ہو گئے۔

سرسید نے خود بھی اپنی ایک تحریر میں نوجوانی کی اس لغزش کی طرف اشارہ کیا ہے:

"ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پہ چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے، جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے اور اپنی قوم کے غم خوار۔" [7]

روزگار کا سلسلہ:

۱۸۳۸ء میں سرسید کی عمر جب تقریباً بائیس سال تھی۔ ان کے والد میر متقی کا انتقال ہوگیا۔ جس کے بعد روزگار کا سارا بوجھ سرسید پہ آپڑا۔ کیونکہ والد کو تلعہ سے جو تنخواہ ملتی تھی، وہ بند ہوگئی۔ سرسید نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کا ارادہ کیا۔ ہر چند کے ان کے رشتہ دار قلعہ معلی سے تعلق توڑنے پر راضی نہ تھے۔ لیکن سرسید اپنی دھن کے پکے تھے، اپنے ارادے پر قائم رہے۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت دلی میں صدر امین تھے۔ ان سے کچہری میں کام سیکھنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر سرسید نے کام سیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ سرسید اس وقت عدالت کی کاروائیوں اور انگریزی قوانین سے بے بہرہ تھے۔ چند ماہ بعد مولوی خلیل اللہ خاں نے انہیں کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ کچھ مدت بعد مسٹر رابرٹ ہملٹن جو سرسید کو پہلے سے جانتے تھے، دلی میں جج ہو کر آئے۔ انھوں نے سرسید کو سیشن عدالت کا سر رشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن سرسید نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ جس کام کی میں اپنے اندر لیاقت نہیں پاتا، اسے کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ [8]

پھر مسٹر رابرٹ ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہوئے تو انہوں نے سرسید کو آگرہ بلا کر کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کے عہدے پر نائز کر دیا۔ یہ فروری ۱۸۳۹ء کا واقعہ ہے۔ یہاں سرسید نے جلد ہی قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔

سرسید ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف ہو گئے۔ اس کے تقریباً دو سال بعد ان کا تبادلہ فتح پور سیکری ہو گیا۔ اس وقت تک سرسید متعدد کتابیں تصنیف کر چکے تھے۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ نے سرسید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ خطاب تھا جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ۔ [9]

از سر نو تعلیم کا شوق:

۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید کا تبادلہ فتح پور سیکری سے دلی ہوگیا۔ یہاں آکر ان میں از سر نو مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے، ان سے فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ مولوی فیض الحسن سے مقامات حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولوی مخصوص اللہ جو شاہ عبد العزیزؒ کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدینؒ کے بیٹے تھے، حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوٰۃ، جامع ترمذی اور کچھ حصہ صحیح مسلم کا ان سے پڑھا اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید نے خود اعتراف کیا ہے، کسی استاد سے انہوں نے کچھ نہیں پڑھا۔ [10]

سرسید کا تبادلہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو دلی سے بجنور ہوگیا۔ اب وہ مستقل صدر امین مقرر ہوئے تھے۔ بجنور میں سوا دو برس گذرے تھے کہ جنگ آزادی جسے سرسید غدر کا نام دیتے تھے، چھڑ گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور سرسید:

حالی لکھتے ہیں کہ سرسید کے خیالات میں انقلاب غدر کے بعد آیا۔ اس وقت وہ بجنور میں تھے انگریز عورتوں اور بچوں سمیت مقیم تھے۔ سرسید نے نہایت ہمت و جواں مردی سے ان لوگوں کی حفاظت کی بلکہ ان کی حفاظت کے لیے جان کا خطرہ مول لیا۔ سرسید کی حسن تدبیر سے انگریز عورتیں اور بچے بہ حفاظت بجنور سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں کے

خلاف لڑنے والے مجاہدوں کے سردار نواب محمود خاں سے اس مقصد کے لیے انہوں نے مذاکرات کیے، اسے سمجھایا بجھایا اور بالآخر اسے قائل کر لیا کہ انگریز خاندانوں کو یہاں سے جانے دیا جائے۔ سرسید نے اس خطرناک موقع پر بھی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف لفظوں میں نواب محمود خاں کو جتلا دیا کہ:

"میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بد خواہی نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں۔"

انہوں نے محمود خاں سے یہ بھی کہا کہ:

"انگریزوں کی عمل داری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عمل داری نہ کر سکے گا۔"

ع

یہ سچ ہے کہ سرسید ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو جہاد نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ شرع کے بموجب یہ ہرگز جہاد نہیں ہے۔[۲۲]

سرسید بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچے تو حال یہ تھا کہ جیب میں صرف چھ پیسے اور بدن پہ ایک پھٹے ہوئے کرتے کے سوا کچھ نہ تھا۔ سرسید نے پانچ مہینے تک میرٹھ میں قیام کیا۔ وہیں انہیں یہ دل خراش خبر ملی کہ دلی میں سرکاری فوج نے ان کا گھر اور تمام سامان و اسباب لوٹ لیا ہے۔ سرسید دلی پہنچے تو والدہ کو تین دن سے فاقے میں پایا۔ وہ والدہ کو لے کر میرٹھ آئے جہاں کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔[۲۳]

۱۶ فروری ۱۸۵۸ء کو سرسید شکسپیئر کے ہمراہ بجنور پہنچے۔ وہاں انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم تھا۔ سرسید نے "بغاوت" میں حصہ لینے والوں کی داد رسی تو نہیں کی البتہ جو لوگ کسی مصلحت، مجبوری یا دباؤ کی وجہ سے "باغیوں" سے مل گئے تھے، سرسید نے جہاں تک ہو سکا انہیں انگریزوں کے جذبۂ انتقام سے بچایا۔ سرسید نے بعد میں "تاریخ سرکشی بجنور" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں انہوں نے سارے حالات قلم بند کیے۔

اپریل ۱۸۵۸ء کو سرسید مراد آباد منتقل ہو گئے۔ انہیں انگریز حکومت نے صدر الصدور کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ اگلے برس "غدر" کے واقعات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن بیٹھا تو سرسید واحد مقامی ممبر تھے۔ دو برس تک کمیشن تحقیقات کرتا رہا۔ حالی لکھتے ہیں کہ مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا گیا ہے کہ کمیشن میں سرسید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غداریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ جائیدادیں جس قدر ضلع مراد آباد میں واگزاشت ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔[۲۴]

خدمات کا صلہ:

سرسید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم میں انگریزوں کی جانیں بچانے کی جو خدمت انجام دی، اس کے صلے میں انگریز سرکار نے انہیں بھاری جائیداد دینی چاہی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کے ایجوکیشنل کانفرنس میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے کہا:

> "جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔"[۲۵]

سرسید کی خدمات کا اجمالی جائزہ:

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جو تباہی و بربادی ہوئی، اس نے سرسید کو مایوسی اور دل شکستگی سے دوچار کر دیا اور انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ بقول خود ان کے:

"میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔"

مگر پھر اس خیال سے کہ "نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو

اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی اوّلاً فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" ۲۶

سرسید نے ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں جہاں کوئی مدرسہ نہ تھا، ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ ۲۷، انہی دنوں انہوں نے حکومت کو اپنی ایک تفصیلی تحریر میں ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا۔

مراد آباد ہی میں انہوں نے یہ دیکھ کر کہ انگریزوں کا سارا غیظ و غضب مسلمانوں پر نازل ہو رہا ہے، "اسباب بغاوت ہند" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر کیا اور اسے شائع کرا کے انگلستان میں پارلیمنٹ کے اراکین کو ارسال کیا۔ سرسید یہ رسالہ لکھ ہی رہے تھے کہ ملکۂ برطانیہ کی جانب سے "باغیوں" کی معافی کا اشتہار شائع ہوا۔ سرسید نے ملکۂ معظمہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء کو مراد آباد میں ایک جلسہ کیا جس میں پندرہ ہزار افراد شریک ہوئے۔ نماز کے بعد سرسید نے مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر اردو میں ایک نہایت پُر اثر مناجات پڑھی۔ ۲۸

انگریزوں کے دل سے یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہ "بغاوت" کے سراسر ذمہ دار مسلمان ہیں۔ سرسید نے ۱۸۶۰ء میں ایک رسالہ بہ موسوم "لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالا۔ اس رسالے میں انہوں نے اس بات کی شہادت فراہم کی کہ "بغاوت" کے دوران انگریزوں سے وفاداری اور جانثاری کا جیسا مظاہرہ مسلمانوں نے پیش کیا، کسی اور قوم نے نہیں کیا۔ اس رسالے کے صرف تین نمبر شائع ہو سکے۔ ۲۹

اس زمانے میں انگریز حکومت عیسائیوں کو نصاریٰ کہنے پر سخت برافروختہ ہوتی تھی اور نصاریٰ لکھنے والوں کو پھانسی کے تختے تک پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ سرسید نے انگریز حکومت کی یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے ایک مختصر رسالہ "تحقیق لفظ نصاریٰ" لکھا اور اسے اردو اور انگریزی میں چھپوا کر تقسیم کیا۔ اس رسالے میں سرسید نے ثابت کیا کہ عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خود کو نصاریٰ کہتے تھے۔ اس رسالے کی اشاعت کا فائدہ یہ ہوا کہ پھر کسی کو اس "

جرم" پہ سزا نہیں دی گئی۔ ۳۰

۱۸۶۰ء میں جب سرسید مراد آباد میں صدر الصدور تھے، اضلاع شمال مغرب میں ایک زبردست قحط پڑا۔ گلنٹر سرجان اسٹریچی نے ضلع کے قحط کا انتظام سرسید کے سپرد کر دیا۔ سرسید نے اس موقع پر اپنے اعلیٰ منتظم ہونے کا ثبوت دیا۔ ۳۱

۱۸۶۱ء میں مراد آباد ہی میں سرسید کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ سرسید کی عمر چوالیس برس تھی۔ دوستوں نے دوسری شادی کے لیے بہت اصرار کیا لیکن انہوں نے کچھ بچوں اور بہت کچھ قوم کی خدمت کرنے کے جذبے کی وجہ سے اس تجویز پر صاد نہیں کیا۔ ۳۲

۱۸۶۳ء میں سرسید کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہو گیا۔ اس وقت تک سرسید اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم کی روشنی نہیں پھیلے گی، ان کی حالت میں انقلاب برپا نہیں ہوگا۔ ہندوستانیوں کو جدید علوم سے واقف کرانے اور انگریزی زبان سے ان کی بیزاری کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اسی سال سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھ دی۔ ۳۳۔ اگلے برس انہوں نے غازی پور میں مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ قومی چندے سے قائم کیا گیا تھا۔

۱۸۶۴ء میں سرسید علی گڑھ آئے۔ سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر بھی یہیں منتقل ہو گیا۔ ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید نے ہندوستان کے مسائل و معاملات کو برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچانے کے لیے برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ ۳۴، اسی سال انہوں نے اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کرنے کی تحریک کی جس کا مقصد تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے مقامی لوگوں کی شمولیت تھی۔ ۳۵، ۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یا اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا، جو ان کی موت کے بعد بھی جاری رہا۔ ۳۶

۵ اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید علی گڑھ سے تبادلہ ہو کر بنارس چلے گئے۔ وہ وہاں جولائی ۱۸۷۶ء تک رہے۔ بنارس میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے ۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو ہومیوپیتھی کا شفاخانہ کھولا۔ پہلے ہی مہینے میں پانچ سو سولہ مریض شفاخانے میں علاج کی غرض سے آئے۔ ۳۷، یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ واپسی پہ انھوں نے "ٹیٹلر" اور اسپیکٹیٹر" کی طرز پہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجراء کیا۔ رسالے کا پہلا شمارہ ۲۴

دسمبر ۱۸۷۵ء کو منظر عام پر آ گیا۔ اسی سال انہوں نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج کھولا جائے۔ ۲۸؎ ۸ جولائی ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں علی گڑھ کالج کا افتتاح ہوا۔

۱۸۷۸ء میں سر سید کو لارڈ لٹن نے وائسریگل قانون ساز اسمبلی کا ممبر مقرر کیا۔ ۱۸۸۳ء انھوں نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ عام ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے یورپ کے سفر پر آمادہ کیا جائے۔ اور چندے سے ایک فنڈ قائم کر کے یورپ جانے والے طلباء کی امداد کی جائے۔ اسی سال انھوں نے ضلع علی گڑھ کے رئیسوں کے تعاون سے علی گڑھ محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ ۲۹؎

۱۸۸۶ء میں سر سید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر علی گڑھ کالج بن بھی گیا تو بھی یہ کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کانفرنس کے ذریعے ملک بھر میں تعلیمی بیداری پیدا کی جائے۔ اور مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو پھیلایا جائے۔ ۳۰؎

اگلے سال ۱۸۸۷ء میں سر سید کو لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کا ممبر بنا دیا۔ سر سید نے انگریزی نہ جاننے کے باوجود اپنے فرائض عمدگی سے انجام دیے۔ ۳۱؎

انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو سر سید نے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے روکا اور حکومت اور انگلستان کے اراکین پارلیمنٹ سے رابطے کے لیے اگست ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی ۳۲؎ اسی سال انہیں نائٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارۂ ہند کا اعزاز ملا۔ اگلے سال ان کی علمی خدمات پر ایڈنبرا کی ایک مشہور یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری عطا کی۔ ۳۳؎

سر سید جنھیں ان کے مذہبی عقائد کی وجہ سے کرسٹان، نیچری اور کافر تک کا بہتان سہنا پڑا تھا، آخری عمر میں انہیں یہ صدمہ پہنچا کہ ایک ہندو کلرک نے جسے انہوں نے کالج کا خزانچی مقرر کر رکھا تھا، کالج کے حسابات میں سے ایک لاکھ روپے کا غبن کیا۔ یہ روپیہ اس کے پکڑے جانے کے باوجود وصول نہ ہو سکا۔ آخری دنوں میں انہیں خاصے خانگی تفکرات نے مضمحل کر دیا

تھا، جو ان کے مشہور بیٹے سید محمود کی بیماری سے پیدا ہو گئے تھے۔ ۳۴؎ چنانچہ اسی سال کی عمر میں یہ بطل جلیل ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو بہ مقام علی گڑھ رحلت کر گیا۔ ۳۵؎

حوالہ جات:

۱۔ شجاع احمد زیبا'' مولوی نذیر احمد اور علی گڑھ تحریک'' مکتبۂ اسلوب کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۷۔

۲۔ اشتیاق حسین قریشی، ''بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء، مترجم: ہلال احمد زبیری، ص ۳۲۵۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۲۶

۴۔ الطاف حسین حالی '' حیات جاوید'' جلد اول، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۸۷۔

۵۔ ایضاً، ص ۹۴

۶۔ ایضاً، ص ۹۶

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۰۔ ضیاء الدین لاہوری، '' خود نوشت حیات سر سید'' جنگ پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص ۵۵

۱۱۔ الطاف حسین حالی بحوالہ بالا، ص ۱۰۷

۱۲۔ ضیاء الدین لاہوری بحوالہ بالا، ص ۵۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۷۔ الطاف حسین حالی، بحوالہ بالا، ص ۱۱۲۔ ۱۱۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۲۲۔ ایضاً